تبسم کاشمیری

راشد : تخاطب، خود کلامی اور مکالمے کی تکنیک

راشد صدی کے موقع پر بہت سا تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا ہے۔ اس میں ترتیب دیا گیا کام زیادہ ہے اور تنقید و تحقیق پر مشتمل تصنیف شدہ کام کم ہے۔ راشد کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ معیار کے حوالے سے اس میں معیاری کام کم ہے اور روایتی کام زیادہ ہے۔ البتہ ایک کام بہت اچھا بھی ہو سکا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی مشکل نظموں کے تجزیے بہت سے افراد نے کیے ہیں اور یوں ان کی نظموں کے ترجموں سے تفہیمِ راشد میں قارئین کے لیے آسانیاں فراہم ہوئی ہیں۔ اس طرح اُن کو سمجھنا نسبتاً آسان ہو سکا ہے۔ ہمارے نئے اور پرانے نقادوں میں جنھوں نے راشد کی نظموں کے تجزیے شائع کیے ہیں ان میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب بھی شامل ہیں۔ اُنھوں نے راشد کی ایک معروف نظم ''اے غزال شب'' کا تجزیہ کیا تھا جو نیا دور کے راشد نمبر میں شائع ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ راشد کی نظموں کے تجزیوں سے تفہیمِ راشد کے لیے ایک عمدہ ادبی فضا پیدا ہوئی ہے۔

راشد کے اسلوب میں ایک striking نقطہ طرزِ تخاطب کا قرینہ ہے۔ میں نے کچھ مقامات پر اسلوب میں ''خود کلامی'' (monologue) کا مشاہدہ کیا اور یوں میں راشد کے ایک اور اہم پہلو سے آشنا ہوا۔ ابھی میں ''تخاطب'' اور ''خود کلامی'' پر غور ہی کر رہا تھا کہ مجھے راشد کے اسلوب سے محوِ کلام ہوتے ہوئے کچھ مکالمے بھی سنائی دیے۔ چناں چہ مجھے محسوس ہوا کہ راشد کا اسلوب گویائی کا اسلوب ہے۔ جس میں کبھی تخاطب کے پیٹرن بنتے ہیں اور کبھی ''خود کلامی'' کا سلسلہ شروع ہو جاتا

* ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ویزٹنگ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

ہے۔ راشد کے ہاں ان نمونوں کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ چوں کہ راشد کی شاعری کے ان پہلوؤں پر اس سے پیشتر لکھا نہیں گیا اس لیے مجھے ان پر کچھ بات ضرور کرنی چاہیے۔

تخاطب کا قرینہ شاعر اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ اظہارِ ذات کے لیے کسی کردار کو مخاطب کرتا ہے۔ اس کردار سے داخلی سطح پر وہ کسی نہ کسی شکل میں موانست کی ایک سطح ضرور محسوس کرتا ہے اور یہ موانست اس کے تخلیقی اظہار کے لیے ایک محرک بن جاتی ہے اور پھر شاعر کے خیالات بہتے ہوئے سامنے آنے لگتے ہیں۔

خود کلامی ذات کے اندر سمٹ جانے کا عمل ہے۔ یہ اس وقت نمودار ہوتی ہے جب شاعر کو سامع کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی یا اس کا داخلی رنگ سامع سے ہم کلام ہونا نہیں چاہتا۔ اس لیے اپنی سمٹی ہوئی دنیا سے جب وہ باہر جھانکتا ہے تو مخاطب کو نہ پا کر وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہونے لگتا ہے اور اس طرح اس کا تخلیقی عمل اپنی شکل بنانے لگتا ہے۔

راشد کی شاعری میں ''تخاطب'' کا قرینہ کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ میں یہاں ''تخاطب'' کی کچھ مثالیں پیش کر کے راشد کے اس خاص انداز کے نمونے دکھاؤں گا۔[۱]

اے خدا تو بھی ذرا
اپنے گل ولا سے اُٹے جوتے اتار

اے مرے وجود کے شیر
مجھ کو جگا بھی دے

اے دوستو! اب آؤ

اے سمندر!
پیکرِ شب، جسم آوازیں
رگوں میں دوڑتا پھرتا لہو

اے غزال شب!
تیری پیاس کیسے بجھاؤں میں

درخت ہوا کتنی تیزی سے گزری
تمہارے برہنہ بدن سے

اے خدا پھر سے اُنڈیل
میرے اس خالی پیالے میں
گناہوں کی شراب

اے مری ذات پھر مجھے وداع کر

مرگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ
وہ خداؤں کا مقرب، وہ خداوندِ کلام

''حسن کوزہ گر'' راشد کی شاہ کار نظم ہے۔ جس میں ساری واردات کا اظہار اوّل سے آخر تک تخاطب کی مسلسل شکلوں اور کہیں کہیں خود کلامی کی شکل میں ملتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''حسن کوزہ گر'' کی تکنیک کا انحصار تخاطب پر ہے۔ اس نظم کا کردار حسن ہے جس کے لاشعور کی رو میں پرانی یادوں کا ہجوم قدم قدم پر منظر نامے بناتا ہے۔ زمانوں کی گرد میں اٹے ہوئے فراموش شدہ منظر بھولی بسری دنیاؤں سے ابھرتے ہیں حسن ان کا نظارہ کرتا ہے۔ اس نظم کے دو مرکزی کردار ہیں۔ حسن اور جہاں زاد نظم کا راوی حسن ہے اور جہاں زاد وہ کردار ہے جو کہیں کہیں نمودار ہوتا ہے۔ مگر وہ نظم کی تمام تر واردات میں موجود ہے۔ حسن کوزہ گر ماضی کی داستانی فینٹسی ہے۔ یہ فینٹسی دراصل dramatic monologue کی ایک خوب صورت شکل ہے جس میں ایک خیالی کردار کسی دوسرے خیالی کردار یا کسی سامع سے مخاطب ہوتا ہے۔ حسن کوزہ گر کی فینٹسی میں تخاطب کی تکنیک ماضی کی گرد میں خوابیدہ داستان سے گرد کو جھاڑتی ہے۔ اس کے خستہ اوراق پلٹتی

ہے اور ماضی آہستہ آہستہ روشن ہونے لگتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ راشد کی بہت سی نظموں کا آغاز تخاطب سے ہوتا ہے اور راشد کی اس شان دار نظم کا آغاز بھی تخاطب کے قرینہ سے ہوتا ہے۔ نظم کا مرکزی کردار حسن اپنی محبوبہ جہان زاد کو دیکھ کر اسے مخاطب کرتے ہوئے اپنے والہانہ جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ تخاطب حسن کی لازوال محبت کی آنچ کا شاہد ہے:

جہاں زاد، نیچے گلی میں ترے در کے آگے
یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف
کی دکان پر میں نے دیکھا
تو تیری نگاہوں میں وہ تابنا کی
تھی میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں
جہاں زاد، نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں!

راشد کے فن میں ان کے طرزِ تخاطب اور اس تخاطب کے پس منظر میں موجود ان کے تہذیبی لاشعور کی نادر مثال حسن کوزہ گر ہی میں ملتی ہے۔ یہاں تہذیب، ثقافت، فن، معاشرت اور تمدن کے نمائندہ نقوش کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اس نظم کی فینٹسی میں ماضی اور حال بار بار overlap کرتے ہیں۔ مختلف حصے اپنے طور پر تہذیبی اکائیاں بناتے جاتے ہیں۔ حُسن، جمال، رنگ اور سرور کی فضا سے ایک نشاطیہ (exotic) کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جہاں بغداد کے اساطیری حوالوں سے نظم میں خواب و خیال کی ایک مسحور کن دنیا آباد ہے جس میں دو الف لیلوی کردار بغداد کی گلیوں، دروازوں اور دریچوں میں موجود نظر آتے ہیں اسی ایک گلی میں جہاں زاد کے گھر کے آگے حسن سوختہ سر سرو مُو پریشان کھڑا نظر آیا تھا[۲] اور وہ ایک غائبانہ حالت میں جہاں زاد کو مخاطب کرنے لگا تھا۔ یہ داخلی خود کلامی کا انداز بھی ہے جس میں کردار اپنے آپ پر گزرنے والی واردات کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ حسن کی اِس فینٹسی میں یہ وارداتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ہر واردات کے اظہار کے لیے تخاطب کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔

حلب کی کارواں سرائے اور رُودِ جلہ کی رات میں بغداد کی نشاطیہ حساسیت ہے،

انبساط و سرخوشی کی ایک دنیا ہے جو وقت کے نقطے پر کھڑی ہے اور اس طرف حسن عمر بھر مڑ مڑ کے دیکھتا رہا تھا۔ اسے زوالِ عمر کا خوف بھی ہے اور اس خوف کے خلاف قربت و انبساط کی بہجت بھی ہے جس سے بدن کے نشاط کی تکمیل ہوتی ہے۔[۳]

''حسن کوزہ گر'' میں صرف تخاطب ہی کی تکنیک نہیں برتی گئی اس میں خود کلامی کے اسالیب بھی موجود ہیں۔ یہاں تخاطب اور خود کلامی کی ملی جلی حالتیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں جہاں نظم کے جمالیاتی موٹف (motif) ایک وجد آفریں کیفیت پیدا کرتے ہیں جس سے شعری انجذاب کی تخلیق ہوتی ہے۔ راشد کی کوئی دوسری نظم ڈرامائی خود کلامی کے یہ منظر پیش نہیں کرتی۔

حسن جہاں کہیں جہاں زاد سے مخاطب ہوتا ہے وہاں کبھی تو episodes بیان کرتا جاتا ہے اور کبھی اپنی ذات کے اندر اتر کر خود کلامی کرنے لگتا ہے۔ لاشعور کی رو اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس رَو میں بہتے ہوئے امیج، خیال اور واقعات تیزی سے لپکنے لگتے ہیں۔

سوچتا ہوں! تو مرے سامنے آئینہ رہی
سر بازار، دریچے میں، سر بستر سنجاب کبھی
تو مرے سامنے آئینہ رہی
جس میں کچھ بھی نظر آیا نہ مجھے
اپنی ہی صورت کے سوا
اپنی تنہائی جانکاہ کی دہشت کے سوا!
لکھ رہا ہوں تجھے خط
اور وہ آئینہ مرے ہاتھ میں ہے
اس میں کچھ بھی نظر آتا نہیں
اب ایک ہی صورت کے سوا!
لکھ رہا ہوں تجھے خط
اور مجھے لکھنا بھی کہاں آتا ہے؟

ہاں کبھی دور درختوں سے پرندوں کی صدا آتی ہے
کبھی زنجیروں کے، زیتونوں کے باغوں کی مہک آتی ہے
میں جی اٹھتا ہوں
تو میں کہتا ہوں کہ لو آج نہا کے نکلا!
ورنہ اس گھر میں کوئی سیج نہیں، عطر نہیں ہے
کوئی پنکھا بھی نہیں
تجھے جس عشق کی خُو ہے
مجھے اس عشق کا یارا بھی نہیں!

جہاں زاد بغداد کی خواب گوں رات
وہ رُودِ دجلہ کا ساحل
وہ کشتی، وہ ملاح کی بند آنکھیں
کسی خستہ جاں، رنج بر کوزہ گر کے لیے
ایک ہی رات وہ کہربا تھی
کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست اس کا وجود
اس کی جاں، اس کا پیکر

جہاں زاد!
وہ حلب کی کارواں سرائے کا حوض، رات وہ سکوت
جس میں ایک دوسرے سے ہمکنار تیرتے رہے
محیط جس طرح ہو، دائرے کے گرد حلقہ زن
تمام رات تیرتے رہے تھے ہم
ہم ایک دوسرے کے جسم و جاں سے لگ کے
تیرتے رہے تھے ایک شاد کام خوف سے

کہ جیسے پانی آنسوؤں میں تیرتا رہے
ہم ایک دوسرے سے مطمئن، زوالِ عمر کے خلاف
تیرتے رہے

''حسن کوزہ گر'' تخاطب اور خود کلامی کے لامتناہی سلسلوں کی ایک فینٹسی ہے جس میں حسن کی یادوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ وہ ایام گذشتہ کے اوراق الٹتا جاتا ہے۔ یادیں اس سے لپٹتی جاتی ہیں۔ اس کا ذہن یادوں اور خوابوں کا مسکن ہے کہ جہاں وہ نیند جیسی حالت میں اونگھتا ہوا ماضی کے رومانس میں گم ملتا ہے۔ لاشعور کی ایک رَو ہے کہ جس کی چاپ برابر سنائی دیتی ہے اور وہ خاموشی کے ساتھ آنکھیں بند کیے ہوئے جہاں زاد کی قاف جیسی طلسمی آنکھوں کے نشے میں سرشار رہتا ہے۔ جہاں زاد حسن کے لیے ایک آدرش ہے۔ حسن و جمال کا حتمی امیج ہے۔ جہاں زاد کے جمال کی کیمیا گری ہی سے حسن کی باطنی دنیا تبدیل ہوئی ہے۔ جہاں زاد کیا ہے؟ جہاں زاد تخلیق ہے حسن کی، حسن کہ جو خالق ہے۔ جہاں زاد اس کی مخلوق ہے۔ خالق، مخلوق اور تخلیق کی تثلیث حسن کے فن سے نکلتی ہے۔[۴]

''حسن کوزہ گر'' میں تخاطب کے قرینہ کے بغیر نظم آگے نہیں بڑھ سکتی نظم کے episodes اپنی جگہ پر ساکت نظر آتے ہیں۔ ان کو تحرک تخاطب ہی سے ملتا ہے۔ تخاطب کے ذریعے ہی سے ان episodes کی آپس میں معنوی پیوستگی ہوتی ہے اور اس قرینہ سے یہ سلسلہ در سلسلہ، کڑی در کڑی جڑتے چلے جاتے ہیں اور پھر باہم مربوط ہو کر ایک معنوی اکائی بن جاتے ہیں۔ یہ واحد نظم ہے کہ جس میں تخاطب ایک کلیدی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ تخاطب کے بعد نظم کی ساخت میں کسی پرانے خیال، بھولے بسرے واقعات یا لاشعور کی رو میں گردش کرتے ہوئے کسی تصور کی تعبیر شروع ہو جاتی ہے۔ کئی خیال نمودار ہوتے ہیں۔ ہر خیال بہت سے سلسلے لے کر آتا ہے۔ ان مراحل میں حسن کبھی خطاب کرتا ہے اور کبھی خود کلامی کرنے لگ جاتا ہے۔

خواب راشد کی شاعری کا ایک گراں بہا سرمایہ ہے۔ انہوں نے *ماورا* سے لے کر گماں کا ممکن تک خواب ہی دیکھے اور یہ خواب ان کی بھرپور تخلیقی قوت کا مظہر معلوم ہوتے ہیں۔ ٹھہراؤ، جمود، انفعالیت اور یاس کی حالتوں میں یہ خواب ہی تحریک اور حرارت کی بڑی طاقت

تھے۔ ان کی نظم ''اَندھا کباڑی''، خوابوں کے لیے مشہور ہے۔ وہ خود تو بصارت سے محروم ہے مگر بصیرت کی زبردست دولت سے مالا مال ہے۔ وہ اپنی بصیرت بانٹنے کے لیے شب و روز پکارتا رہتا ہے۔ مگر اس کے پاس کوئی نہیں آتا، مال تو نایاب ہے مگر کیا کرے کہ گاہک ہی بے خبر ہیں۔ یہ ایک اعتبار سے پیغمبرانہ قسم کا کردار ہے۔ وہ سر بازار التجائیں کرتا پھرتا ہے کہ ''خواب لے لو۔ خواب'' ۔ستم یہ ہے کہ اس کا معاشرہ خواب دیکھنے سے محروم ہو چکا ہے اور جب وہ ''خواب لے لو'' کی صدا بلند کرتا ہے تو لوگ اس پر شک کرتے ہیں۔ لوگ بے یقینی اور بے سمتی کی حالت میں چلتے رہتے ہیں ۔ یہ کباڑی ہر رات مایوس ہو کر اپنے خوابوں کی دولت لیے ہوئے گھر لوٹ جاتا ہے۔ یہاں بھی راشد نے تخاطب کا قرینہ استعمال کیا ہے:

''خواب لے لو خواب ___''
صبح ہوتے چوک میں جا کر لگاتا ہوں صدا ___
''خواب اصلی ہیں کہ نقلی ؟''
یوں پرکھتے ہیں کہ جیسے ان سے بڑھ کر
خواب داں کوئی نہ ہو!
شام ہو جاتی ہے
میں پھر سے لگاتا ہوں صدا
''مفت لے لو مفت ___ یہ سونے کے خواب ___''
''مفت'' سن کر اور ڈر جاتے ہیں لوگ ___
رات ہو جاتی ہے
خوابوں کے پلندے سر پہ رکھ کر
منہ بسورے لوٹتا ہوں
رات بھر پھر بڑبڑاتا ہوں
یہ لے لو خواب ___
میرے خواب ___
خواب ___ میرے خواب ____

''دل مرے صحرا نورد ِ پیر دل'' میں راشد کا تخاطب تبدیل ہوتا ہے۔ اب تک مختلف کرداران کے مخاطب رہے ہیں۔ ان کی موانست بالخصوص جہاں زاد سے رہی ہے کہ جس کا تذکرہ قدرے وضاحت سے ہم کر چکے ہیں۔ بہت سے کرداروں سے تخاطب اور خود کلامی کی منزلوں کے بعد جب ہم ''دل مرے صحرا نورد ِ پیر دل'' کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں راشد کا خطاب نظم کے کرداروں سے نہیں اپنے دل سے ہے۔ اس نظم میں دل کے تخاطب سے انہوں نے حکمت و دانش اور تجربہ کی باتیں بیان کی ہیں۔

اس نظم کا شعری عکس ایک بڑے شعری منظر نامہ کو پیش کرتا ہے جہاں صحرا اپنے تلازمات کے ساتھ آزادی کی بنیادی علامت بن جاتا ہے۔ یہ علامت شعری انبساط اور فکری نشاط سے معمور ہے اور اس میں سرخوشی کی ایک ایسی بسیط لے سنائی دیتی ہے کہ جس کے آہنگ کا تسلسل حال سے مستقبل کے دروازوں کی طرف بڑھتا ہے۔ اس میں بہتر انسانی مستقبل کے لیے بشارت بھی ہے۔ یہ تمناؤں کے بے پایاں الاؤ میں ہے اور اس الاؤ کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ نظم ایک شعری کشف کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۵

دل، مرے صحرا نورد ِ پیر دل
یہ تمناؤں کا بے پایاں الاؤ
راہ گم کردوں کی مشعل، اس کے لب پر ''آؤ! آؤ!''
تیرے ماضی کے خزف ریزوں سے جاگی ہے یہ آگ
آگ کی خرمن زباں پر انبساطِ نو کے راگ
دل، مرے صحرا نورد ِ پیر دل
سرگرانی کی شبِ رفتہ سے جاگ!

تخاطب اور خود کلامی کی راشد کے شعری آلات میں جو اہمیت ہے اس کے بارے میں کچھ باتیں کر چکا ہوں اور اب میں مکالمے کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔

جس طرح تخاطب اور خود کلامی کے قرینے نے راشد کو ڈرامائی رنگ عطا کیا ہے اسی طرح سے مکالمے نے ان کی نظم کو ڈرامائی نظم بنا دیا ہے۔ ان کی نظم میں مکالمے کے اسالیب حد درجہ چست اور برجستہ ہیں۔ مکالموں کی تمازت اور ان کے اندر سے پھوٹتی ہوئی گویائی مکالمہ کو

ایک زندہ مکالمہ بنا دیتی ہے اور اس کا منظر نامہ زندگی سے شرابور نظر آتا ہے۔ جیتے جاگتے متحرک منظر اور ان میں نہایت جان دار مکالمے ایک لازوال کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک نمونہ درج ذیل ہے:

میں اک گرم خانے کے پہلو میں صوفے پر تنہا پڑا سوچتا تھا
بخاری میں افسردہ ہوتے ہوئے رقص کو گھورتا تھا
''اجازت ہے میں بھی
ذرا سینک لوں ہاتھ اپنے؟''
(زبان فارسی تھی تکلم کی شیرینیاں اصفہانی!)
''تمھیں شوق شطرنج سے ہے؟''
(اٹھا لایا میں اپنے کمرے سے شطرنج جا کر!)
''بچو فیل___
اسپِ سیہ کا تو خانہ نہیں یہ___
بچاؤ وزیر___
اور لو یہ پیادے کی شہ لو___
اور اک اور شہ!
اور یہ آخری مات!
بس ناز تھا کیا اسی شاطری پر؟''
میں اچھا کھلاڑی نہیں ہوں
مگر آن بھر کی خجالت سے میں ہنس دیا تھا!
''ابھی اور کھیلو گے؟
لو اور بازی___
یہ اک اور بازی___''

حوالہ جات

۱۔ اس مقالے میں شامل تمام شعری حوالے یہاں سے لیے گئے ہیں: ن۔م۔راشد کلیاتِ راشد (لاہور: ماورا پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء)۔
۲۔ تبسم کاشمیری، لا=راشد (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۴ء)، ۱۹۔
۳۔ کاشمیری، لا=راشد، ۲۰۔
۴۔ کاشمیری، لا=راشد، ۲۶۲۔
۵۔ کاشمیری، لا=راشد، ۱۱۔

مآخذ

راشد، ن۔م۔ کلیاتِ راشد۔ لاہور: ماورا پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء۔
کاشمیری، تبسم۔ لا=راشد۔ لاہور: نگارشات، ۱۹۹۴ء۔